ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ
ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ
يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَۨا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ

یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے[۱۸۰]، اس کے لیے دردناک سزا ہے ـــــ عقل و خرد رکھنے والو! تمھارے لیے قِصاص میں زندگی ہے[۱۸۱]۔ اُمّید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو، تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے

کر دیں اور اس صورت میں عدالت کے لیے جائز نہیں کہ قاتل کی جان ہی لینے پر اصرار کرے۔ البتہ جیسا کہ بعد کی آیت میں ارشاد ہوا، معافی کی صورت میں قاتل کو خوں بہا ادا کرنا ہوگا۔

۱۷۹ – ''مَعْرُوْف'' کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہُوا ہے۔ اس سے مراد وہ صحیح طریقِ کار ہے، جس سے بالعُموم انسان واقف ہوتے ہیں، جس کے متعلق ہر وہ شخص، جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو، یہ بول اُٹھے کہ بے شک حق اور انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریقِ عمل ہے۔ رواجِ عام (common law) کو بھی اسلامی اصطلاح میں ''عُرف'' اور ''معروف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور وہ ایسے تمام معاملات میں معتبر ہے، جن کے بارے میں شریعت نے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔

۱۸۰ – مثلاً یہ کہ مقتول کا وارث خوں بہا وصول کر لینے کے بعد پھر انتقام لینے کی کوشش کرے، یا قاتل خوں بہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور مقتول کے وارث نے جو احسان اس کے ساتھ کیا ہے، اس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔

۱۸۱ – یہ ایک دُوسری جاہلیّت کی تردید ہے، جو پہلے بھی بہت سے دماغوں میں موجود تھی اور آج بھی بکثرت پائی جاتی ہے۔ جس طرح اہلِ جاہلیّت کا ایک گروہ انتقام کے پہلو میں افراط کی طرف چلا گیا، اسی طرح ایک دُوسرا گروہ عَفو کے پہلو میں تفریط کی طرف گیا ہے اور اس نے سزائے موت کے خلاف اتنی تبلیغ کی ہے کہ بہت سے لوگ اس کو ایک نفرت انگیز چیز سمجھنے لگے ہیں اور دُنیا کے متعدّد ملکوں نے اسے بالکل منسوخ کر دیا ہے۔ قرآن اسی پر اہلِ عقل کو مُخاطب کر کے تنبیہ کرتا ہے کہ قِصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے۔ جو سوسائٹی انسانی جان کا احترام نہ کرنے والوں کی جان کو

Scanned with OKEN Scanner

وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ
بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا
فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٨٢﴾ ع

ع ٢٢ ٦

وصیّت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔[١٨٢] پھر جنھوں نے وصیّت سنی اور بعد میں اُسے بدل ڈالا، تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہوگا۔ اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ البتہ جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وصیّت کرنے والے نے نادانستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے، اور پھر معاملے سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان وہ اصلاح کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

محترم ٹھیراتی ہے، وہ دراصل اپنی آستین میں سانپ پالتی ہے۔ تم ایک قاتل کی جان بچا کر بہت سے بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرے میں ڈالتے ہو۔

١٨٢ – یہ حکم اُس زمانے میں دیا گیا تھا، جب کہ وِراثت کی تقسیم کے لیے ابھی کوئی قانون مقرر نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت ہر شخص پر لازم کیا گیا کہ وہ اپنے وارثوں کے حصّے بذریعۂ وصیّت مقرر کر جائے، تاکہ اس کے مرنے کے بعد نہ تو خاندان میں جھگڑے ہوں اور نہ کسی حق دار کی حق تلفی ہونے پائے۔ بعد میں جب تقسیمِ وراثت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود ایک ضابطہ بنا دیا (جو آگے سورۂ نساء میں آنے والا ہے)، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ وصیّت اور احکامِ میراث کی توضیح میں حسبِ ذیل دو قاعدے بیان فرمائے:

ایک یہ کہ اب کوئی شخص کسی وارث کے حق میں وصیّت نہیں کر سکتا، یعنی جن رشتے داروں کے حصّے قرآن میں مقرر کر دیے گئے ہیں، ان کے حصوں میں نہ تو وصیّت کے ذریعے سے کوئی کمی یا بیشی کی جا سکتی ہے، نہ کسی وارث کو میراث سے محروم کیا جا سکتا ہے، اور نہ کسی وارث کو اس کے قانونی حصّے کے علاوہ کوئی چیز بذریعۂ وصیّت دی جا سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ وصیّت کل جائداد کے صرف ایک تہائی حصّے کی حد تک کی جا سکتی ہے۔

اِن دو تشریحی ہدایات کے بعد اب اس آیت کا منشا یہ قرار پاتا ہے کہ آدمی اپنا کم از کم دو تہائی مال تو اس لیے چھوڑ دے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ حسبِ قاعدہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی حد تک اسے اپنے اُن غیر وارث رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنی چاہیے، جو اس کے اپنے گھر میں یا اس کے

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا
مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ
مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ
طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیرووں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔[۱۸۳] چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دُوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے،[۱۸۴] تو یہ اُسی کے لیے بہتر ہے۔

خاندان میں مدد کے مستحق ہوں، یا جنھیں وہ خاندان کے باہر محتاجِ اعانت پاتا ہو، یا رفاہِ عام کے کاموں میں سے جس کی بھی وہ مدد کرنا چاہے۔ بعد کے لوگوں نے وصیّت کے اس حکم کو محض ایک سفارشی حکم قرار دے دیا، یہاں تک کہ بالعُموم وصیّت کا طریقہ منسوخ ہی ہو کر رہ گیا۔ لیکن قرآنِ مجید میں اسے ایک حق قرار دیا گیا ہے، جو خدا کی طرف سے متقی لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس حق کو ادا کرنا شروع کر دیا جائے، تو بہت سے وہ سوالات خود ہی حل ہو جائیں، جو میراث کے بارے میں لوگوں کو اُلجھن میں ڈالتے ہیں۔ مثلاً اُن پوتوں اور نواسوں کا معاملہ جن کے ماں باپ دادا اور نانا کی زندگی میں مر جاتے ہیں۔

۱۸۳ – اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیّت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف ہر مہینے تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ پھر ۲ ہجری میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا، مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں، وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دُوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دُودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لیے، جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان میں اُن سے چھوٹ گئے ہیں۔

۱۸۴ – یعنی ایک سے زیادہ آدمیوں کو کھانا کھلائے، یا یہ کہ روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلائے۔

وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ
الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى
وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ
كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ

لیکن اگر تم سمجھو، تو تمھارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔[۱۸۵]

رمضان وہ مہینا ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے، جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے، اُس کو لازم ہے کہ اِس پُورے مہینے کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دُوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔[۱۸۶]

۱۸۵ – یہاں تک وہ ابتدائی حکم ہے، جو رمضان کے روزوں کے متعلق ۲ ہجری میں جنگِ بدر سے پہلے نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد کی آیات اس کے ایک سال بعد نازل ہوئیں اور مناسبتِ مضمون کی وجہ سے اسی سلسلۂ بیان میں شامل کر دی گئیں۔

۱۸۶ – سفر کی حالت میں روزہ رکھنا یا نہ رکھنا آدمی کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو صحابہؓ سفر میں جایا کرتے تھے، اُن میں سے کوئی روزہ رکھتا تھا اور کوئی نہ رکھتا تھا، اور دونوں گروہوں میں سے کوئی دُوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا۔ خود آنحضرتؐ نے بھی کبھی سفر میں روزہ رکھا ہے اور کبھی نہیں رکھا ہے۔ ایک سفر کے موقع پر ایک شخص بدحال ہو کر گر گیا اور اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر دریافت فرمایا: کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا: روزے سے ہے۔ فرمایا: یہ نیکی نہیں ہے۔ جنگ کے موقع پر تو آپؐ حکماً روزے سے روک دیا کرتے تھے، تاکہ دشمن سے لڑنے میں کمزوری لاحق نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی رِوایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو مرتبہ رمضان میں جنگ پر گئے۔ پہلی مرتبہ جنگِ بدر میں اور آخری مرتبہ فتحِ مکہ کے موقع پر، اور دونوں مرتبہ ہم نے روزے چھوڑ دیے۔ ابنِ عمرؓ کا بیان ہے کہ فتحِ مکہ کے موقع پر حضورؐ نے فرما دیا تھا کہ انه یوم قتال فافطروا۔ دُوسری رِوایات میں یہ الفاظ ہیں کہ انکم قد دنوتم من عدوکم فافطروا اقویٰ لکم۔ یعنی دشمن سے مقابلہ درپیش ہے، روزے چھوڑ دو، تاکہ تمھیں لڑنے کی قوت حاصل ہو۔

وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ
اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶
لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ
لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ
مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝۷ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ
اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ

اور جو غریب ہو، وہ معروف طریقے سے کھائے[11]۔ پھر جب اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنالو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔

مَردوں کے لیے اُس مال میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اُس مال میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت[12]، اور یہ حصّہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

اور جب تقسیم کے موقع پر کنبے کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو

۱۱ – یعنی اپنا حق الخدمت اس حد تک لے کہ ہر غیر جانب دار معقول آدمی اس کو مناسب تسلیم کرے۔ نیز یہ کہ جو کچھ بھی حق الخدمت وہ لے، چوری چھپے نہ لے، بلکہ عَلانیہ متعیّن کر کے لے اور اس کا حساب رکھے۔

۱۲ – اس آیت میں واضح طور پر پانچ قانونی حکم دیے گئے ہیں: ایک، یہ کہ میراث صرف مَردوں ہی کا حصّہ نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اس کی حق دار ہیں۔ دوسرے، یہ کہ میراث بہر حال تقسیم ہونی چاہیے، خواہ وہ کتنی ہی کم ہو، حتّٰی کہ اگر مرنے والے نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو اسے بھی دس حصّوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ یہ اَور بات ہے کہ ایک وارث دوسرے وارثوں سے ان کا حصّہ خرید لے۔ تیسرے، اس آیت سے یہ بات بھی مُترشّح ہوتی ہے کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال و املاک پر جاری ہوگا۔ خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، زرعی ہوں یا صنعتی، یا کسی اور صنفِ مال میں شمار ہوتے ہوں۔ چوتھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میراث کا حق اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب مورث کوئی مال چھوڑ مرا ہو۔ پانچویں، اِس سے یہ قاعدہ بھی نکلتا ہے کہ قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر رشتہ دار میراث نہ پائے گا۔

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝٨ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ
خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا
قَوْلًا سَدِيْدًا ۝٩ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا
اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۗ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝١٠ ع
يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ

اور اُن کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔[۱۳]

لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انھیں اپنے بچّوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں، درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنّم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔[۱۴] ع

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ:

مرد کا حصّہ دو عورتوں کے برابر ہے۔[۱۵]

۱۳ - خطاب میّت کے وارثوں سے ہے اور انھیں ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقع پر جو دور و نزدیک کے رشتہ دار اور کنبے کے غریب و مسکین لوگ اور یتیم بچے آ جائیں، ان کے ساتھ تنگ دلی نہ برتو۔ میراث میں از رُوئے شرع اُن کا حصّہ نہیں ہے تو نہ سہی، وُسعتِ قلب سے کام لے کر ترکے میں سے اُن کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو، اور ان کے ساتھ وہ دل شکن باتیں نہ کرو جو ایسے مواقع پر بالعموم چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ کیا کرتے ہیں۔

۱۴ - حدیث میں آیا ہے کہ جنگِ اُحُد کے بعد حضرت سعدؓ بن ربیع کی بیوی اپنی دو بچّیوں کو لیے ہوئے نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انھوں نے عرض کیا کہ "یا رسولؐ اللہ! یہ سعد کی بچّیاں ہیں جو آپؐ کے ساتھ اُحُد میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے چچا نے پوری جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لیے ایک حبّہ تک نہیں چھوڑا ہے۔

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ
وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ
مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ
اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ

اگر (میّت کی وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔[16]

اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔

اگر میت صاحبِ اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصّہ ملنا چاہیے۔[17]

اور اگر وہ صاحبِ اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصّہ دیا جائے۔[18]

اور اگر میّت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصّے کی حق دار[19] ہوگی۔

اب بھلا ان بچّیوں سے کون نکاح کرے گا۔'' اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

۱۵- میراث کے معاملے میں یہ اوّلین اُصولی ہدایت ہے کہ مرد کا حصّہ عورت سے دوگُنا ہے۔ چونکہ شریعت نے خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ مَعاشی ذمّہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی مَعاشی ذمہ داریوں کے بار سے سُبکدوش رکھا ہے، لہٰذا انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ میراث میں عورت کا حصّہ مرد کی بہ نسبت کم رکھا جاتا۔

۱۶- یہی حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اس کی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں، تو خواہ دو لڑکیاں ہوں یا دو سے زائد، بہرحال اس کے کُل ترکے کا $\frac{2}{3}$ حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہوگا، اور باقی $\frac{1}{3}$ دوسرے وارثوں میں۔ لیکن اگر میّت کا صرف ایک لڑکا ہو تو اس پر اجماع ہے کہ دوسرے وارثوں کی غیر موجودگی میں وہ کُل مال کا وارث ہوگا، اور دوسرے وارث موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی سب مال اُسے ملے گا۔

۱۷- یعنی میّت کے صاحبِ اولاد ہونے کی صُورت میں بہرحال میّت کے والدین میں سے ہر ایک $\frac{1}{6}$ کا

مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ
اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا

(یہ سب حصّے اُس وقت نکالے جائیں گے) جب کہ وصیّت جو میّت نے کی ہو پُوری کر دی جائے اور قرض جو اُس پر ہو ادا کر دیا جائے۔[۲۰]

تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظِ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصّے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں، اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف

حق دار ہوگا۔ خواہ میّت کی وارث صرف بیٹیاں ہوں، یا صرف بیٹے ہوں، یا بیٹے اور بیٹیاں ہوں، یا ایک بیٹا ہو، یا ایک بیٹی۔ رہے باقی $\frac{2}{3}$، تو ان میں دُوسرے وارث شریک ہوں گے۔

۱۸ – ماں باپ کے سوا کوئی اور وارث نہ ہو تو باقی $\frac{2}{3}$ باپ کو ملے گا۔ ورنہ $\frac{2}{3}$ میں باپ اور دُوسرے وارث شریک ہوں گے۔

۱۹ – بھائی بہن ہونے کی صورت میں ماں کا حصہ $\frac{1}{3}$ کے بجائے $\frac{1}{6}$ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ماں کے حصّے میں سے جو $\frac{1}{6}$ لیا گیا ہے، وہ باپ کے حصّے میں ڈالا جائے گا، کیونکہ اس صُورت میں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ میّت کے والدین اگر زندہ ہوں تو اس کے بہن بھائیوں کو حصّہ نہیں پہنچتا۔

۲۰ – وصیّت کا ذکر قرض پر مقدّم اس لیے کیا گیا ہے کہ قرض کا ہونا ہر مرنے والے کے حق میں ضروری نہیں ہے، اور وصیّت کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ لیکن حکم کے اعتبار سے اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ قرض وصیّت پر مقدّم ہے۔ یعنی اگر میّت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے میّت کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا، پھر وصیّت پوری کی جائے گی، اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔ وصیّت کے متعلق سُورۂ بقرہ حاشیہ نمبر ۱۸۲ میں ہم بتا چکے ہیں کہ آدمی کو اپنے کُل مال کے $\frac{1}{3}$ حصّے کی حد تک وصیّت کرنے کا اختیار ہے، اور یہ وصیّت کا قاعدہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ قانونِ وراثت کی رو سے جن عزیزوں کو میراث میں سے حصّہ نہیں پہنچتا، ان میں سے جس کو یا جس جس کو آدمی مدد کا مستحق پاتا ہو، اس کے لیے اپنے اختیارِ تمیزی سے حصّہ مقرر کر دے۔ مثلاً کوئی یتیم پوتا یا پوتی موجود ہے، یا کسی بیٹے کی بیوہ مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے، یا کوئی بھائی یا بہن یا بھاوج یا بھتیجا یا بھانجا یا اور کوئی عزیز ایسا ہے جو سہارے کا محتاج نظر آتا ہے، تو اس کے حق میں وصیّت کے ذریعے سے حصّہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے تو دوسرے مستحقین کے لیے یا کسی رفاہِ عام کے کام میں صَرف کرنے کے لیے وصیّت کی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی کُل مِلکیّت میں سے $\frac{2}{3}$ یا اس سے کچھ زائد کے متعلق شریعت نے میراث کا ضابطہ بنا دیا ہے، جس میں سے شریعت کے

حَكِيمًا ﴿١١﴾ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن
لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِن
بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا
تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ
الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ

اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔[۲۱]

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصّہ تمھیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صُورت میں ترکے کا ایک چوتھائی حصّہ تمھارا ہے جب کہ وصیّت جو انھوں نے کی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔ اور وہ تمھارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحبِ اولاد ہونے کی صُورت میں اُن کا حصّہ آٹھواں[۲۲] ہوگا، بعد اس کے کہ جو وصیّت تم نے کی ہو وہ پُوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔

نامزد کردہ وارثوں کو مقرّرہ حصّہ ملے گا۔ اور $\frac{1}{3}$ یا اس سے کچھ کم کو خود اس کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے مخصوص خاندانی حالات کے لحاظ سے (جو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کے معاملے میں مختلف ہوں گے) جس طرح مناسب سمجھے، تقسیم کرنے کی وصیّت کر دے۔ پھر اگر کوئی شخص اپنی وصیّت میں ظلم کرے، یا بالفاظِ دیگر، اپنے اختیارِ تمیزی کو غلط طور پر اس طرح استعمال کرے جس سے کسی کے جائز حُقوق متأثّر ہوتے ہوں تو اس کے لیے یہ چارۂ کار رکھ دیا گیا ہے کہ خاندان کے لوگ باہمی رضا مندی سے اس کی اصلاح کر لیں، یا قاضیِ شرعی سے مداخلت کی درخواست کی جائے اور وہ وصیّت کو دُرست کر دے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو میرا رسالہ ''یتیم پوتے کی وراثت'')

۲۱ – یہ جواب ہے اُن سب نادانوں کو جو میراث کے اس خدائی قانون کو نہیں سمجھتے اور اپنی ناقص عقل سے اس کسر کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو اُن کے نزدیک اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں رہ گئی ہے۔

۲۲ – یعنی خواہ ایک بیوی ہو یا کئی بیویاں ہوں، اولاد ہونے کی صورت میں وہ $\frac{1}{8}$ کی، اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں $\frac{1}{4}$ کی حصّہ دار ہوں گی، اور یہ $\frac{1}{4}$ یا $\frac{1}{8}$ سب بیویوں میں برابری کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا۔

وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ
اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ
مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى
بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو، تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصّہ ملے گا، اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کُل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں[۲۳] گے، جب کہ وصیّت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو میّت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے، بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو[۲۴]۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا

۲۳ - باقی ۵/۶ یا ۲/۳ جو بچتے ہیں، ان میں اگر کوئی اور وارث موجود ہو تو اس کو حصّہ ملے گا، ورنہ اس پُوری باقی ماندہ مِلکیّت کے متعلّق اس شخص کو وصیّت کرنے کا حق ہوگا۔

اس آیت کے متعلق مفسرین کا اجماع ہے کہ اس میں بھائی اور بہنوں سے مُراد اَخیافی بھائی اور بہن ہیں، یعنی جو میّت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔ رہے سگے بھائی بہن، اور وہ سوتیلے بھائی بہن جو باپ کی طرف سے میّت کے ساتھ رشتہ رکھتے ہوں، تو ان کا حکم اِسی سورہ کے آخر میں ارشاد ہُوا ہے۔

۲۴ - وصیّت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حُقوق تلف ہوتے ہوں۔ اور قرض میں ضرر رسانی یہ ہے کہ محض حق داروں کو محروم کرنے کے لیے آدمی خواہ مخواہ اپنے اُوپر ایسے قرض کا اقرار کرے جو اس نے فی الواقع نہ لیا ہو، یا اور کوئی ایسی چال چلے جس سے مقصود یہ ہو کہ حق دار میراث سے محروم ہو جائیں۔ اس قسم کے ضِرار کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ وصیت میں نقصان رسانی بڑے گناہوں میں سے ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی تمام عمر اہلِ جنّت کے سے کام کرتا رہتا ہے، مگر مرتے وقت وصیّت میں ضرر رسانی کر کے اپنی کتابِ زندگی کو ایسے عمل پر ختم کر جاتا ہے جو اُسے دوزخ کا مستحق بنا دیتا ہے۔ یہ ضِرار اور حق تلفی اگرچہ ہر حال میں گناہ ہے، مگر خاص طور پر کَلالہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ جس شخص کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں، اس میں عُموماً یہ میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی جائداد کو کسی نہ کسی طرح تلف کر جائے اور

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

جلد اول

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی

Scanned with OKEN Scanner

MARKAZI MAKTABA ISLAMI PUBLISHERS

NEW DELHI

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی

Scanned with OKEN Scanner